میں سمجھ گئی۔ ہوں نہ ہوں بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے۔ آخر پتا لگا لیا نا!

میں:۔ اچھا چلتی ہوں، سواری لائے ہو؟

خدمت گار:۔ حاضر ہے۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحب سے مل کے جایئے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے، بیگم صاحب خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی۔ ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی۔

عورتیں:۔ بھلا اب کیا آؤ گی۔

گھر پر جو آ کے دیکھتی ہوں، بوا حسینی اور میاں گوہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں، رونے لگیں، میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی:۔ اللہ بیٹی! کیا سخت دل کر لیا۔ تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں۔

میں بجائے خود شرمندہ تھی، جواب کیا دیتی، جھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ، انہوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے، بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی، جو چلی آئی تھیں، وہ دن کانپور سے اسباب وغیرہ کے باندھنے اور مکان کے کرائے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرائے پر لی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لاد لیا اور فضول سامان نوکروں کو دیدیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئی۔ پھر وہی آب و دانہ ہے، وہی مکان، وہی کمرا، وہی آدمی۔

دشت جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

(3)

دیکھئے پہنچے کہاں تک سوزش دل کا اثر
صرصر وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک رہا۔ اسی اثنار میں شہزادے مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتے چلے گئے، وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں باغی فوج نے مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا، میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا، مبارک باد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا، کل وہ گرفتار ہوا، پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں تھے، ان کا تعین در دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے، اس لئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجرے کے لئے بھی وقت بے وقت طلبی ہو جاتی تھی۔ اب چند روزہ حکومت کے زمانے میں برجیس قدر کے گیارھویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسے میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرت مہتاب ہے برجیس قدر
گوہر نایاب ہے برجیس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لئے تصنیف کی تھی، اس کا مطلع یہ ہے۔

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

رسوا:۔ امراؤ جان! تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے۔ اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔

امراؤ:۔ گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم! سوا اس مطلع کے اور کوئی شعر یاد نہیں۔ وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا، نگوڑی دن رات جان دھڑکے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچے پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں، وہ پرچہ میرے پان دان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا، ہول جول میں پان دان کیسا، جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

رسوا:۔ بھلا کچھ یاد ہے؟ بیگم صاحب کس دن قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراؤ:۔ دن تو یاد نہیں، ہزاری روزے، کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوا:۔ ہاں تمہیں خوب یاد رہا، رجب کی انتیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل کون سی تھی؟

امراؤ۔ اخیر جاڑے تھے، نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا۔ بالکل درست۔ مارچ کی سولہویں تاریخ تھی۔ اچھا تو تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں؟

امراؤ۔ جی ہاں، بونڈی تک میں ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ "لو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں۔" دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا۔" تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر دھاوا کیا ہے، اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں، میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

رسوا۔ سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لئے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔

امراؤ۔ آپ نے تو سنا ہے، میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔

رسوا۔ اچھا اس قصے سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہئے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا، اس کا حشر کیا ہوا؟

امراؤ۔ (ایک سرد آہ بھر کے) اے ہے یہ نہ پوچھئے۔

رسوا۔ غدر میں سب لٹ گیا؟

امراؤ۔ غدر میں لٹ جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔

رسوا۔ پھر کیا ہوا؟

امراؤ۔ سارا قصہ دہرانا پڑا۔ جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی، میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں، اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔ خانم کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے، امام باڑے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ میں اکثر چارپائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان کے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انہوں نے

فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گودڑ میں لپٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں ان کا کیا کر لیتی، مگر واہ ری بیوی! ایک حبہ تک نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھمنا ہوا ہے۔ نہیں تو کب کی قیامت آجاتی۔

رسوا:۔ بھلا کتنے کا مال ہو گا؟

امراؤ:۔ کوئی دس پندرہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا:۔ اور اب کیا ہوا؟

امراؤ:۔ کیا ہوا؟ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

رسوا:۔ مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمہارا ایک حبہ بھی غدر میں نہیں لٹا، سب مال تمہارے پاس ہے۔

امراؤ:۔ اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔

رسوا:۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنا بھگل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں۔ خوش خوراک خوش پوشاک بھی ہو۔

امراؤ:۔ خدا رازق ہے۔ جو جس کا خرچ ہے وہ ضرور اس کو ملتا ہے۔ اس مال کا تو ایک حبہ بھی نہیں رہا۔

رسوا:۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟

امراؤ:۔ اب کیا بتاؤں، ایک مہربان ۔۔۔۔۔

رسوا:۔ میں سمجھ گیا۔ یہ گوہر مرزا کی حرکت ہو گی؟

امراؤ:۔ میں اپنے منہ سے نہیں کہتی، شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

رسوا:۔ بیشک تمہارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھئے وہ چین کر رہے ہیں اور تمہیں پوچھتے تک نہیں۔

امراؤ:۔ مرزا صاحب! رنڈی سے رسم رہا رہا، نہ رہانہ رہا۔ اب وہ مجھے کیوں پوچھیں۔

مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہو گئی

رسوا:۔ اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

امراؤ:۔ وہ کاہے کو تشریف لائیں گے۔ میں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ان کی بیوی سے محبت ہو گئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

رسوا:۔ جب بھی کچھ دے ہی آئی ہو گی؟

امراؤ:۔ جی نہیں، میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

رسوا:۔ تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے ہتھے لگا؟

امراؤ:۔ مرزا صاحب! مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ہاتھوں کا میل ہے، فقط بات رہ جاتی ہے۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں! کبھی تنگی بھوکی نہیں رہتی۔ آپ ایسے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے! مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا:۔ اس میں کیا شک ہے۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اب بھی سو سے اچھی، ہزار سے اچھی۔ واللہ! یہ تمہاری نیت کا ثمرہ ہے۔ خدا نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

امراؤ:۔ جی ہاں، مولا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے:۔

پھر مجھے کربلا بلا بھیجیں
میری مٹی عزیز ہو جائے

مرزا صاحب میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا، مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا، پھر نہ آؤں گی۔

(4)

سن چکے حال تباہی کا مری، اور سنو
اب تمہیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

بوندی سے بیگم صاحب اور برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرائے میں اتری، پھر ترپولئے کے پاس ایک کمرا کرائے کو لے لیا، میراثی نوکر رکھ لئے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہے۔ آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آ جاتا ہے۔ اس پر بسر ہے۔ تمام شہر میں

میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں بھی یاد آجاتی ہیں، اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ مگر انتزاع سلطنت، غدر، برچھیں قدر یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجا پتھر کا ہو گیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو۔ اگر ہو تو اب ان کو مجھ سے کیا مطلب۔ وہ اور عالم میں ہوں گے۔ میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہی یہ باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی، مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا، دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے، کس کے لئے جاؤں، خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا، ان سے اب کیوں کر بنے گی۔ وہ وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا، وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا، میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہو گا۔ اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اور اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے، میرے ہاتھ گلے میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے۔

ایک دن کمرے میں بیٹھی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت اندھیرے سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کر دیا، حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا بہو بیگم صاحب کے عزیزوں سے ہیں، وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں مقبرے کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں:۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے؟

نواب صاحب:۔ اکثر مر گئے، نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا، بالکل نیا انتظام ہے۔

میں:۔ اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب:۔ ہاں تھے، مگر تم کیا جانو؟

میں:۔ غدر سے پہلے میں ایک محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انہوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب:۔ وہی جمعدار نا! جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی؟

میں:۔ مجھے کیا معلوم؟ (دل میں، ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے!)۔

نواب:۔ یوں تو کئی جمعدار تھے، اور اب بھی ہیں، مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں:۔ ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب:۔ تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں:۔ اسی دن ان کے ساتھ تھا۔ ایسی بھی شکل ملتے کم دیکھی ہے۔ بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب:۔ جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لئے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی، میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی، گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کر مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا، اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا، وہاں گئی۔ محلے کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت پرانا املی کا درخت تھا، اسی کے نیچے نمگیرہ تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا، بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے دہشت سی ہوتی تھی۔ دل امنڈا چلا آتا تھا۔ صاف یہی جی میں آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لئے میں قناتوں سے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں، ماں کے قدموں پر گر پڑوں، وہ گلے لگا لیں گی۔ مگر جرات نہ ہوتی تھی، اس لئے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے بہت ہی پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے! صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر

میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے!

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا "تمہی لکھنؤ سے آئی ہو؟"

میں:۔ ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)۔

عورت:۔ اچھا تو ادھر چلی آؤ، تمہیں کوئی بلاتا ہے۔

میں اچھا کہہ کر اس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی اور پڑتا کہیں تھا۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا، اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکر کھڑی ہوئیں۔

ایک:۔ لکھنؤ سے تمہی آئی ہو؟

میں:۔ جی ہاں۔

دوسری:۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں:۔ (جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن، مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی:۔ تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟

میں:۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے، جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی:۔ تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں:۔ (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے، بہ مشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری:۔ کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں:۔ ذات کی پتریا تو نہیں ہوں، تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔

پہلی:۔ (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر کہو پھر تم کون ہو؟

میں:۔ (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں۔ اب بالکل تاب ضبط نہ تھی، سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا، اس نے میرے منہ کو

ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کر دوسری کو دکھایا "کیوں، ہم نہ کہتے تھے وہی ہے؟"

دوسری "ہائے میری امیرن" کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں بیٹھیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آکر چھڑایا۔

اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھی رہیں۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی، مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آکے کل روپیہ مجرے کا واپس دے دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولہا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر میرا جو حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پلنگ پر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی آدھی رات گئے ایک جوان سا آدمی، سانولی رنگت، کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے میں آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے، ملا کو بلا کے چپکے سے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان:۔ کل تمہی مجرے کو گئی تھیں؟ (یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی)۔

میں:۔ ہاں۔

اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان:۔ (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا؟

میں:۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان:۔ ہم سمجھے تھے کہ تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو۔

میں:۔ بے غیرت زندگی تھی، نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے!

جوان:۔ بیشک۔ اس زندگی سے موت لاکھ درجے بہتر تھی۔ تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا یا کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

میں:۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی اور نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی، اب سہی۔

جوان:۔ اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں۔ اور آئی بھی تھیں تو اس محلے میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں:۔ ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی، مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

جوان:۔ اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں:۔ اب کیا ہوتا ہے۔

جوان:۔ (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے! اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔ اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا تو چیخنے۔ "ارے دوڑو، بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔"

جوان:۔ (چھری گلے سے ہٹا کے، ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی ۔۔۔۔۔ اتنا کہہ کے دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے ہی رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی، جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجے پر پہنچا تھا اس سے دم بخود سی ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا، میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا، کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارے سے منع کیا۔ ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دونوں خوب رو دھو چکے۔

جوان:۔ (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں:۔ کل چلی جاؤں گی، مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان:۔ بس اب دل سے دور رکھو، معاف کرو۔ کل اماں نے تمہیں گھر پر بلا لیا، میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت دارا نیارا ہو جاتا۔ محلے بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں:۔ تم نے دیکھ لیا، جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہائے تمہاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو! خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان:۔ برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں:۔ اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی، ماما نے اور جان کھانا شروع کی۔

"یہ کون تھے؟"

میں:۔ رنڈی کے مکان پر ہزار آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے، تمہیں کیا؟

بہر طور ماما کو ٹال دیا۔ رات کی رات سو رہی، صبح کو اٹھ کے لکھنؤ چلنے کی تیاری کی، شاموں شام شکرم کرائے کر کے روانہ ہو گئی۔

kitaabiyat.pk

حصہ سوم

(1)

نہ پوچھو ہم سے کیو نکر زندگی کے دن گ

لکھنؤ میں آکر خانم کے مکان پر اتری۔ وہی چوک، وہی کم
سے کچھ لوگ کلکتے چلے گئے تھے، کچھ اور شہروں میں نکل گئے
جاری تھے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔ چاروں
دروازے سے لے کر دریا تک دور دور مکان کھدے ہوئے پڑے
رہی تھیں۔ گلیوں میں کھرنجے بنائے جاتے تھے۔ نالے نالیاں
اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

دو چار مہینے خانم کے مکان پر ہی رہی۔ اس کے بعد یہ لطائ
شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بد
بے پروائی سی ہو گئی تھی۔ جو رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں
ان کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا
گزرا۔ دوسرے تیسرے دن میں جاتی تھی۔ سلام کر کے چلی آتی
خاں صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے کچھ دنوں تشریف لایا
پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ میں رہوں او
ترک کر دوں۔ جب میں نے نواب صاحب کی طبیعت کا یہ رنگ
صاحب نے عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ مجھ سے نکاح ہے۔ عجب

گزرتے ہیں

را، وہی ہم ہیں۔ اگلے آنے والوں میں
تھے۔ شہر میں نیا انتظام، نئے قانون
طرف دھس بنے ہوئے تھے۔ گول
تھے۔ جابجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل
صاف کی جاتی تھیں۔ غرضیکہ لکھنؤ

ف الحیل ایک علیحدہ کمرا لے کر رہنا
رل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی
ں ان کا تو ذکر کیا، جو ساتھ رہتی تھیں
بھی کچھ ان کے مزاج کے خلاف نہ
تھی۔ اس زمانے میں نواب محمود علی
کئے۔ پھر نوکر رکھا، اس کے بعد مجھے
ر اپنے قدیم ملنے والوں سے ملاقات
ف دیکھا، ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب
ب آفت میں جان پھنسی۔ مقدمے کی

پیروی میں ہزاروں صرف ہوئے۔ عدالت ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش ہونا پڑا۔ مدتوں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی۔ اپیل میں نواب صاحب ہارے۔ نواب صاحب نے عدالت عالیہ میں اپیل کی، یہاں بھی ہارے۔ اب ناجائز دھمکیاں دینا شروع کیں۔ "مار ڈالوں گا، ناک کاٹ لوں گا"۔ اس زمانے میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لئے دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں، یہ آدمی فینس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ناک میں دم ہوگیا۔ آخر میں نے فوج داری میں مچلکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرا دیا کہ بے شک نواب صاحب درپئے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے مچلکہ لے لیا۔ اب جا کے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی، خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانے میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا، ایک صاحب اکبر علی خاں نامی مختار پیشہ، چلتے پرزے، آفت کے پرکالے، ناجائز کارروائیوں میں مشاق، جعل سازی میں استاد، جھوٹے مقدمات بنانے میں وحید عصر، عدالت کو دھوکہ دینے میں یکتائے زماں، میری طرف سے پیروکار تھے۔ ان کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ حق تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں نواب صاحب سے سرپر نہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا، مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لئے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا، لیکن مقدمہ اس سلیقے سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کئے گئے تھے جن کے ماتھوں پر گٹے پڑے ہوئے، بڑے بڑے عمامے سر پر، عبائیں زیب دوش، ہاتھوں میں کنٹھے، پاؤں میں کفشیں، بات بات میں قال اللہ قال الرسول۔ ان کی صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا، کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ نکاح کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوحہ کے مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق، جرح میں بگڑ گئے۔ نواب کے اور گواہ ان سے زیادہ بگڑے، اور انہی گواہوں کی گواہی سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوج داری میں میری طرف سے جو گواہ پیش کئے گئے تھے، وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے، بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمد و رفت میرے مکان پر بہت زمانے تک رہی۔ انہوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی کا ادا کیا۔ ایک حبہ نہیں لیا، بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ برے آدمی بالکل برے نہیں ہوتے، کسی نہ کسی

سے بھلے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہو گا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس سے پورا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص سب سے برا ہو وہ کس کا ہو کے رہے گا۔ جب تک نواب سے مقدمہ رہا میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی، مبادا اس کا بھیجا ہوا ہو، خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خان ایک مرتبہ صبح کو کچہری جاتے وقت اور پھر شام کو کچہری سے پلٹ کے میرے مکان پر آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگوانے کی کیا ضرورت، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔ میں بھی انہی کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانے میں میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔ اکبر علی خاں کو تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط ان کا اعتقاد یہی تھا۔

رسوا۔ یہ معاملہ ایمان کا ہے، اس لئے اتنا مجھے کہہ لینے دیجئے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

امراؤ۔ میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا۔ عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے، اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں (اگرچہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو)۔ جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے ان کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر ان کا برا اثر پڑا ہو۔ تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہو گا۔

بے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

امراؤ جان! یاد رکھو مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے۔ اس کی بخشش کہیں نہیں ہے۔ اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ اللہ خدا کی خدائی بے کار ہے۔

امراؤ۔ میاں، میرا تو بال بال گناہ گار ہے، مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں۔

رسوا۔ مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہو گی؟

امراؤ۔ پھر یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپے ہم نے کمائے،

ہزاروں اڑائے۔

رسوا۔ پھر اس کی کیا سزا ہو گی؟

امراؤ۔ اس کی سزا نہ ہونی چاہیئے۔ ہم نے جس قسم کی دل آزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اس دل آزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔

رسوا۔ کیا خوب!

امراؤ۔ فرض کیجئے ایک صاحب نے ہم کو میلے تماشے میں کہیں دیکھ لیا، مرنے لگے۔ کوڑی پاس نہیں۔ ہم بے لئے مل نہیں سکتے۔ ان کا دل دکھتا ہے، پھر اس میں ہمارا کیا قصور! دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ روپیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے، اپنا دل۔ ان کی جان پر بنی ہے۔ پھر ہماری بلا سے۔ بعض ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ فقط ہمیں چاہو ہم نہیں چاہتے۔ اجارہ ہے؟ اس سے ان کو صدمہ پہنچتا ہے۔ پھر ہماری پاپوش سے۔

رسوا۔ یہ سب گولی مار دینے کے لائق ہیں۔ مگر برائے خدا! کہیں مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجئے گا۔

امراؤ۔ خدا نہ کرے۔ آپ خوش باشوں میں ہیں۔ نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں، نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا۔ یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے اور نہیں بھی ہے۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

امراؤ۔ میں منطق تو زیادہ پڑھی نہیں مگر ہو سکتا ہے۔ جب ایک بات کے دو پیرائے ہوں۔ ایک چاہنا عقل مندی کے ساتھ ہے اور ایک بے وقوفی کے ساتھ۔

رسوا۔ اس کی مثال؟

امراؤ۔ پہلے کی مثال جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں، میں آپ کو۔

رسوا۔ خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور آپ کے چاہنے کا حال آپ کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔ آگے چلئے، دوسری مثال۔

امراؤ۔ خیر اگر نہیں چاہتے تو میرا برا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے کی مثال سنئے۔ جیسے فریاد رس الٰہی۔

رسوا:۔ نہیں اس مثال پر آپ نے غلطی کی۔ اور کوئی مثال دیجئے۔

امراؤ:۔ اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا۔

رسوا:۔ آپ بھی کیا دقیانوسی مثال ڈھونڈ کے لائی ہیں۔

امراؤ:۔ اچھا جیسے ۔۔۔۔ نظیر ۔۔۔۔

رسوا:۔ (بات کاٹ کے) اس مثال سے معاف کیجئے۔ اس موقع پر مجھ کو ایک شعر یاد آیا ہے، سن لیجئے اور اپنا قصہ دہرائیے۔

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم
ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے

امراؤ:۔ ہاں وہ کلکتے والا معاملہ؟

رسوا:۔ اتنی دور کہاں پہنچ گئیں۔ کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے؟

امراؤ:۔ دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا:۔ ہاں میں نے سنا تھا، آپ اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی تھیں؟

امراؤ:۔ مجھ سے سنئے، جس زمانے میں نواب عدالت ابتدائی سے جیت گئے ہیں اور میں روپوش ہوئی ہوں، اس زمانے میں اکبر علی خاں مجھے اپنے مکان پر لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں تین آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی کے گھر بیٹھ گئی۔ ایک تو خود اکبر علی، دوسرے ان کی بیوی، تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا:۔ میں بتا دوں؟

امراؤ:۔ گوہر مرزا؟

رسوا:۔ جی نہیں!

امراؤ:۔ تو پھر اور کون؟ بتائیے۔

رسوا:۔ آپ بتائیے۔

امراؤ:۔ ایسے فقرے کسی اور کو دیجئے گا۔

رسوا:۔ فقرہ کیسا! میں ایک پرچے پر لکھ کے رکھ دیتا ہوں، پھر آپ بتائیے۔

kitaabiyat.pk

امراؤ:۔ بہتر۔

رسوا:۔ پرچہ لکھ کے رکھ دیا۔ اب کہیے۔

امراؤ:۔ تیسرے میں خود۔

(پرچے میں لکھا تھا "آپ خود")

امراؤ:۔ واہ مرزا صاحب! خوب پہچانا۔

رسوا:۔ آپ کی عنایت ہے۔ ہاں تو کیا گزری؟

امراؤ:۔ گزری کیا، سنیئے۔

اول تو انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے جا کے اتارا جو ان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان تھی۔ مواکچا سا مکان، ایک چھوٹی سی دلنیہ، آگے چھپر۔ ایک اور چھپر سامنے پڑا ہوا۔ اس میں دو چولہے بنے ہوئے۔ یہ کیا ہے؟ باورچی خانہ اور سب خانے بھی ایسے ہی سمجھ لیجئے۔ اسی مکان میں میں بھی رہوں اور میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا جائیں۔ ان میں سے ایک صاحب رئیس موضع شیخ افضل حسین چھوٹتے ہی "بھوجی" کہنے لگے۔ ان کے بے تکلفی نے ناک میں دم کر دیا۔ پانوں کی فرمائش سے تنگ ہو گئی۔ ہر سٹے "بھوجی پان نہ کھلاؤ گی؟"

ایک دن دو دن، آخر مروت کہاں تک۔ انتہا یہ کہ پان دان میں نے ان کے آگے سرکا دیا۔ اس دن سے میں خود دست بردار ہو گئی۔ انہوں نے قبضہ کر لیا، جیسے کوئی مال موروثی پر قبضہ کرتا ہے۔ پان اس بد تمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں پڑ رہی ہیں، زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا، چکنی کے چورے اور الائچی پر بسر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ ساجھا لگاتے تھے۔ ایک اور صاحب واجد علی نامی اکثر کھانے کے وقت ضرور تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں۔ اکبر علی خاں کے برادر نسبتی تھے۔ ان کے مذاق میں فحش حد اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ دن رات قانون چھانٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تو اک ذرا امن ہو جاتا تھا، کیونکہ انہیں مقدموں کی باتیں سننے سے نفرت تھی۔

اس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ اکتا گئی۔ قریب تھا کہ کہیں اور رہنے کا بندوبست کروں، کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی کسی مقدمے میں نیض آباد گئے، افضل

حسین اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے کی کنڈی بند کر لی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی، جو زنانے مکان کی دیوار میں تھی، کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نہ خواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تختوں کا چوکا بچھا تھا۔ اسی کے پاس میرا پلنگ لگا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چپکی کھڑی رہیں۔ آخر میں نے کہا۔ "یا اللہ بیٹھ جایئے۔" بارے بیٹھ گئیں۔

میں:۔ ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی۔ آج ادھر کہاں تشریف آئی۔

بیوی:۔ تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں۔

میں:۔ جی نہیں، آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم تو مناسب بھی ہے۔

بیوی:۔ لے باتیں نہ بناؤ۔ اگر میرا گھر ہے تو تمہارا بھی گھر ہے۔ اور سچ پوچھو تو نہ میرا نہ تمہارا، گھر تو گھر والے کا ہے۔

میں:۔ جی نہیں! خدا رکھے آپ کے گھر والے کو، ان کا بھی ہے اور آپ کا بھی۔

بیوی:۔ یہ تم اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ ادھر کیوں نہیں چلی آتیں۔ ہاں میاں کا حکم ہو گا۔

میں:۔ میاں کے حکم کی کچھ ایسی تابع نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی، وہ حاصل ہو گئی۔ اب حاضر ہوں گی۔

بیوی:۔ اچھا تو چلئے۔

میں:۔ چلئے۔

مکان میں جا کر جو دیکھتی ہوں، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ تانبے کے مٹکے، دیگ، گگرے، پتیلیاں، لوٹے، نواڑی پلنگ، مسہری، تختوں کی چوکیاں، فرش فروش، مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔ انگنائی میں جا بجا کوڑا پڑا ہے۔ باورچی خانے میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ تختوں کے چوکے پر پیک کے چھینٹے پڑے ہوئے۔ بیوی کے پلنگ پر منوں کوڑا۔ امن نے پان دان لا کے بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ کتھے چونے کے دھبوں میں سارا پان دان چھپا ہوا تھا۔ دیکھ کے میرا جی مالش کرنے لگا۔

بیوی نے پان لگا کے دیا، میں نے چٹکی میں دبا لیا، باتیں کرنے لگی۔ اسی اثنا میں محلہ کی ایک بڑھیا آ نکلی۔ زمین پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ بیوی سے (میری طرف) اشارہ کر کے پوچھا "یہ کون ہیں؟"

بیوی:۔ اب تمہیں کیا بتاؤں؟

میں چپکی بیٹھی رہی۔ بڑھیا (اکبر علی خاں کی بیوی سے)

بڑھیا:۔ اوئی! جیسے میں جانتی نہیں۔

میں:۔ بڑی بی! پھر جانتی ہو تو پوچھنا کیا۔

بڑھیا:۔ اوئی بی! تم سے بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے پوچھتی ہوں۔ میرا منہ تم سے بات کرنے کے لائق نہیں۔ تم بڑی آدمی ہو۔

میں بڑھیا کا منہ دیکھ کے چپ ہو رہی۔

بیوی:۔ اوہی بڑھیا! ذرا سی بات میں جھاڑ کا کانٹا ہو گئی۔

بڑھیا:۔ (بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو جیسے ہم دشمن ہیں۔ اے لو، ہم تو ان کی بھلائی کے لئے بات کرتے ہیں، یہ ہمی سے الٹے بگڑتی ہیں۔

بیوی:۔ لے بس، اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ بوا! تم کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو؟

بڑھیا:۔ ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔ اب جو نئی نئی آتی جائیں گی ان کا اجارہ ہوتا جائے گا۔

بڑھیا کی اس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ منہ پھیر کے ہنسنے لگی۔

بیوی:۔ کیوں نہیں، اے تم بھی میری سوت ہو نا۔ (میری طرف مخاطب ہو کے) سن لو، خان صاحب کی پہلی یہی ہیں۔ لو بیوی تم اصل میں ان کی سوت ہو۔ میں تو ان کے بعد آئی ہوں۔

بڑھیا:۔ وہ سوت ہوں اپنے ہوتے سوتوں کی۔ مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ منہ در منہ گالیاں دیتی ہو۔ موئی کسبیوں، خانگیوں کی صحبت میں اور کیا سیکھو گی۔ اتنے دن مجھے آئے ہوئے، بڑی بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ) نے آدھی بات مجھے نہیں کہی۔ بہو صاحب گنونتی ایسی ہیں کہ محلے کی بڑھیوں کو گالیاں دیتی ہیں۔

بیوی:۔ (غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا مدن کی ماں! تم آج سے میرے پاس نہ آنا۔ وہیں بڑی بیگم کے پاس جا کر بیٹھا کرو۔

مجھے بھی بہت غصہ تھا، مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے۔ اس کے منہ کون لگے، ضبط کر کے چپکی ہو رہی۔

بڑھیا:۔ ہماری بلا آتی ہے۔۔۔۔۔